مدارسِ دینیہ میں عصری اور دُنیوی تعلیم.....

حضرت مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی صاحب

[دینی مدارس میں جدید عصری علوم کی اہمیت اور عدم اہمیت پر ''ماہنامہ وفاق'' میں مختلف نقطۂ نظر کے حامل مضامین شائع کئے جارہے ہیں، دارالافتاء والارشاد اور جامعۃ الرشید کراچی کے بانی حضرت مفتی رشید احمد لدھیانوی رحمہ اللہ نے ایک سوال کے جواب میں اس موضوع پر آج سے ۳۸ سال قبل جو مضمون لکھا، وہ نذر قارئین ہے۔] (مدیر)

سوال: کسی دارالعلوم کے طلبہ کو علوم مقصودہ کے ساتھ مولوی فاضل اور ایم اے کرانا اور ضمناً وتبعاً ان کو دینی ماحول میں دیندار اساتذہ کے ذریعہ انگریزی زبان پڑھانا اور بعض علوم جدیدہ جیسے عالمی جغرافیہ، سائنس، فلسفہ وجدید نفسیات اور شہریت وعمران پڑھانا جائز، خدمتِ خلق ورضاءِ حق کا ذریعہ ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا۔

الجواب باسم ملهم الصواب

دیندار ماحول میں اور دیندار اساتذۃ کی نگرانی میں علومِ جدیدہ کی تحصیل بنیتِ خدمتِ خلق ورضاءِ حق بلاشبہ موجب اجروثواب ہے مگر مدارس دینیہ میں ان علوم کا اجراء تجربہ سے مضر ثابت ہوا ہے۔

اولاً اس لئے کہ بعض مدارس دینیہ میں علوم جدیدہ کو تبعاً وضمناً جاری کیا گیا مگر چند روز ہی میں وہ مدرسہ سوائے علم دین کے باقی سب فنون کا مرکز بن گیا اور علم دین برائے نام رہ گیا، اور پھر چند ایام کے بعد علم دین کا نام بھی ختم ہوگیا، اس کی بہت سی نظائر ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اس صورت میں مدرسہ کی زمین، عمارت اور متعلقہ سامان جو تعلیم دین کے لئے وقف تھا قیامت تک تعلیم دنیا اور بالواسطہ یا بلاواسطہ ہدم دین کے لئے استعمال ہوگا جس کا سارا وبال خشت اول رکھنے والے پر ہوگا، بالفرض ہدم دین کا باعث نہ بھی بنے تو بھی جو وقف علم دین کے لئے مخصوص تھا اسے علم دنیا کے لئے مخصوص کردینے اور ہمیشہ کے لئے جہت وقف کے بدل دینے کا عذاب تو بہرکیف ہوگا۔

ثانیاً اگر بالفرض کسی مدرسہ دینیہ میں علم دین ہی غالب رہے گا تو اس استعداد کے طلبہ کہاں سے لائے جائیں گے جو علوم دینیہ ودنیویہ دونوں میں مہارت حاصل کرسکیں۔ جب ان علوم دینی میں استعداد حاصل کرنے

والوں کی تعداد ایک فیصد سے زیادہ نہیں، اور علوم جدیدہ کے طلبہ کا معیار تو اس سے بھی زیادہ گرا ہوا ہے۔

ثالثاً اگر بفرض محال لاکھوں میں سے کوئی ایک آدھ فرد، دونوں علوم کا ماہر ہو بھی جائے تو کیا وہ علم دین کی کوئی خدمت کرے گا؟ حاشا وکلا اسے تو دنیوی ہوس اور حب مال وجاہ نہ صرف یہ کہ خدمت علم دین کا موقع نہیں دیتی بلکہ اس سے متنفر کر دیتی ہے۔ چنانچہ اس کی کوئی نظیر پیش نہیں کی جاسکتی کہ دونوں قسم کے علوم میں کوئی ماہر فرد دین کی کوئی بنیادی معتد بہ خدمت کر رہا ہو، یہ صحیح ہے کہ ایسا آدمی اگر اخلاص سے دنیوی خدمت کرے تو وہ بھی باعث اجر ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ اگر اسے علوم دنیویہ کی تعلیم نہ دی جاتی تو وہ دین کی خدمت کرتا علوم دنیویہ کی تعلیم نے اسے خدمت دین سے محروم کر دیا پھر اس کے دعوائے اخلاص میں بھی شبہ ہوتا ہے کہ حقیقت کا کچھ حصہ بھی ہے یا کہ محض نفسانی کید ہے، اگر واقعی رضائے الٰہی مقصود ہوتی تو قدرتِ خدمت دین ہوتے ہوئے خدمت علوم دنیویہ کو کیوں اختیار کیا؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طلبِ مال وجاہ کے سوا کچھ مقصود نہیں۔ مشاہدہ ہے کہ عموماً ایسے حضرات کے قلب سے عمل کا اہتمام مٹ جاتا ہے بلکہ بیشتر کے تو نظریات بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ غرضیکہ مدارس دینیہ میں اگر ان علوم جدیدہ کو ذرا سی بھی جگہ دی گئی تو خطرہ ہے کہ چند سال کے بعد ایک فرد بھی خدمت دین کرنے والا نہ ملے گا، اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے آمین۔

لہٰذا مدارس دینیہ کو برباد کرنے کی بجائے کالجوں کی اصلاح کی طرف توجہ کرنا چاہیے، وہاں اساتذہ دیندار متعین کئے جائیں اور ماحول کو دیندار بنانے کی کوشش کی جائے، نصاب میں علم دین کا معتد بہ حصہ رکھا جائے، مدارس دینیہ میں اگر قدیم نصاب محنت سے پڑھایا جائے تو سوائے انگریزی زبان کے باقی تمام فنون دنیویہ میں بھی کالجوں کے طلبہ سے زیادہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے چنانچہ فنون قدیمہ میں کچھ سوجھ بوجھ رکھنے والے بعض ایسے افراد اب تک بھی موجود ہیں کہ علوم جدیدہ میں مہارت کے مدعی ان کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ حساب، اقلیدس (جیومیٹری) اور ہیئت وغیرہ ضروری علوم کو مدارس دینیہ سے اس طرح خارج کر دیا گیا ہے کہ گویا یہ ان کے نصاب میں کبھی داخل ہی نہ تھے، حقیقت یہ ہے کہ ان علوم کے سوا علم دین کی تکمیل ہی ناممکن ہے۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو علوم جدیدہ کوئی چیز ہی نہیں، یہ سب علوم قدیمہ ہی کا چربہ ہے وہ بھی ناقص اور نامکمل، انہی علوم قدیمہ کے نام جدید تجویز کر دیئے گئے ہیں؟ یا پھر متجد دیا کا فرملحد مصنف کی جدید تصنیف کا طبائع پر برا اثر پڑتا ہے۔

غور فرمائیے کہ ہدایہ کے پڑھنے والے اور ہدایہ کا انگریزی ترجمہ ''محمڈن لاء'' پڑھنے والے عمل اور سلامت طبع ونظر فکر میں برابر ہو سکتے ہیں؟ یہ فرق ''محمڈن لاء'' کو ہدایہ کا ترجمہ سمجھتے ہوئے ہے تو جہاں تصانیف کو

مستقل بلکہ تحقیق جدید اور مصنف کو ترقی یافتہ قوم کا ہیرو سمجھا جائے اور ذہن اس سے اتنا مرعوب ہو کہ اس کی کسی تحقیق کو بنظرِ تنقید دیکھنا جرم عظیم ہو، اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات میں تو معاذ اللہ شبہات پیدا ہوں، مگر مغربی مصنف کی کسی بات میں شبہہ کی کوئی گنجائش نہ ہو تو ظاہر ہے کہ ایسے علوم حاصل کرنیوالوں کا انجام کیا ہوگا۔

بیان مذکور سے بعض حضرات کے اس قیاس کا جواب بھی ہوگیا جو فرماتے ہیں کہ متقدمین بھی تو سرکاری زبان اور علوم دنیویہ پڑھتے تھے اور ان میں بصارت رکھتے تھے، سو واضح ہو کہ متقدمین کی سرکاری زبان ایک مسلم قوم کی زبان تھی اور فنون کی کتب کے مصنفین بھی مسلمان تھے اور اساتذہ بھی اور وہ خودداری وخوداعتمادی اور جمیع علوم وفنون میں سبقت وامتیاز کے اتنے اونچے مقام پر تھے کہ انہیں پوری دنیا کی اقوام ہیچ نظر آتی تھیں اس لئے ان پر سرکاری زبان سیکھنے یا دنیوی علوم وفنون حاصل کرنے میں کوئی خراب اثر پڑنے کا کوئی امکان نہ تھا، وہ سرکاری زبان اور دنیوی علوم کو اپنے گھر کی چیز سمجھتے تھے۔ آج کے مسلمان کی طرح اغیار بلکہ ارباب کی دریوزہ گری اور جبین سائی کا تصور نہ رکھتے تھے بلکہ اس کے برعکس وہ پوری دنیا کے لئے چشمہ فیض تھے، دنیا بھر کی اقوام ان کے آستانوں سے بھیک مانگ کر آج ترقی کا ڈھنڈورا پیٹ رہی ہیں۔ غرضیکہ متقدمین کے لئے سرکاری زبان اور علوم دنیویہ میں مہارت خودداری وخوداعتمادی اور تفوق استغناء کا باعث تھی، اس کے برعکس سوئے قسمت سے آجکل انہی علوم کی بطریق جدید تعلیم، ذہنی پستی اور اغیار کی غلامی واحتیاج کو قلب میں مکمل طور پر راسخ کر رہی ہے اور مسلمانوں کی گردن کو احسان اغیار کے بار عظیم سے اس طرح دبائے ہوئے ہے کہ ان کو اس سے نجات دلانے کے لئے کوئی نسخہ بھی کارگر نہیں ہو رہا۔ اسی غلامانہ ذہنیت اور احساس کمتری کا یہ کرشمہ ہے کہ پانچویں صدی کے مسلمان ابوریحان بیرونی سے استفادہ کر کے تو اغیار چاند اور زہرہ پر پہنچ رہے ہیں جس کا روس نے اعتراف کیا ہے مگر آج کے مسلمان ماہرین فلکیات دوسروں کی نقل میں بھی فحش غلطیاں کر رہے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ گرینچ کی شاہی رصدگاہ نے روشنی کی ابتداء کا جو وقت بتایا ہے اسے پاکستان وہندوستان کے ماہرین فلکیات صبح صادق قرار دے کر اسکے مطابق جنتریاں مرتب کر کے ملک بھر میں شائع کر چکے ہیں۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ متقدمین علوم دنیویہ میں مہارت حاصل کرنے کے بعد بھی تقویٰ اور زہد کی بدولت نہ خدمت علم دین سے غافل ہوتے تھے اور نہ ہی انہیں کوئی علمی کوتاہی واقع ہوتی تھی، نظریاتی تبدیلی تو درکنار ان میں سے اکثر ہر قسم کی مہارت رکھنے کے باوجود فقر وفاقہ کے عالم میں بھی خدمت دین میں مشغول رہتے تھے اور اسی کو سعادت سمجھتے تھے اور بعض نے دنیوی ترقی کی بھی تو بڑے بڑے مناصب جلیلہ پر فائز ہونے اور مقربین سلاطین ہونے کے بعد بھی انکے اعتقاد وعمل اور خدمت دین میں کوئی نقص واقع نہ ہو بلکہ اس جاہ ومال کو مزید خدمت دین کا ذریعہ بنا کر دنیا کو بھی دین بنا دیا گیا، اس کے برعکس

آجکل ہوس اور حب مال وجاہ کا اس قدر غلبہ ہے کہ علوم دینیہ بطریق جدید حاصل کرنے کے بعد خدمتِ علم دین کا تصور بھی ناممکن ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مدارس دینیہ میں علومِ دینیہ خصوصاً حساب وہیئت اور اقلیدس کی تعلیم اشد ضروری ہے مگر کتب قدیمہ کے ذریعہ صرف اساتذہ کتب جدیدہ کا مطالعہ کریں، کوئی کام کی بات پائیں تو طلبہ کو اس طریق سے سمجھائیں کہ کتب جدیدہ اور ان کے مصنفین کا تفوق ان کے ذہن میں نہ آنے پائے، اگر کتبِ قدیمہ ناکافی ہوں تو علماء دین جدید تصنیف کریں، اس سے بھی زیادہ ضروری یہ ہے کہ طریق تعلیم کی اصلاح کریں، زیادہ کتابیں پڑھانے کی بجائے تمرین (عملی مشق) زیادہ کرائی جائے، کسی کالج کے تعلیم یافتہ کی تصنیف خواہ وہ کتنا ہی صالح اور متقی کیوں نہ ہو طلبہ کے اذہاں پر یہ اثر ضرور ڈالے گی کہ انہیں یہ علوم مغرب سے ملے ہیں، ان علوم کو اگر بذریعہ کتب جدیدہ مدارسِ دینیہ میں لایا گیا تو ایک طرف تو ان کی اور ان کے مصنفین کی خباثت کا بہت برا اثر پڑے گا اور اس کے ساتھ ساتھ نصرانیت سے ذہن مرعوب ہوگا اور دوسری طرف یہ نقصان ہوگا کہ غلبۂ ہوس کی وجہ سے یہ لوگ عصری امتحانات دے کر خدمتِ دین کی بجائے حکومت کی ملازمت اختیار کریں گے جس میں خدمتِ دین سے حرمان کے علاوہ عملی واعتقادی خرابیاں بھی عموماً پیدا ہو جاتی ہیں، اگر خدانخواستہ سب مدارس دینیہ نے یہ کارِ خیر شروع کر دیا اور اپنا نیم پختہ مال سرکاری دفاتر اور دُنیوی منڈیوں میں بھیجنا شروع کر دیا تو آئندہ علم دین کا کوئی مدرس پیدا ہونے کی کوئی توقع نہ رکھنا چاہیے اور علم دین کو صرف چند روزہ مہمان ہی سمجھنا چاہیے، ممکن ہے کہ قرب قیامت میں رفع علمِ دین کا سبب یہی نظریہ بننے والا ہو، اللہ تعالیٰ ہمیں یہ وقت نہ دکھائیں، آمین۔

انگریزی زبان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے سیکھنے سے علماء دین کی خدمت زیادہ کر سکتے ہیں، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ کون سا مسئلہ ہے جس کا حل انگریزی زبان پر موقوف ہے جب کہ مخالف وموافق ہر قسم کی کتب کے دفاتر اردو میں موجود ہیں، اگر اس کا خدمتِ دین میں معین ہونا تسلیم بھی کر لیا جائے تو دیکھنا یہ ہے کہ اس کا کوئی مصداق بھی دنیا میں موجود ہے یا نہیں۔ اگر آپ اس کا جائزہ لیں کہ کیا کوئی انگریزی خواندہ عالم دین کی کوئی بنیادی خدمت کر رہا ہے تو یقیناً اسے کالعدم ہی پائیں گے، اس سے میرا مقصود یہ ہرگز نہیں کہ انگریزی زبان سیکھنا ناجائز ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ دین کی کوئی خدمت اس پر موقوف نہیں، لہٰذا علماء دین کے لئے انگریزی زبان سیکھنا بے ضرورت اور غیر مفید ہے بلکہ اکثر طبائع کے لئے تو مضر ہے، آخر میں پھر گزارش ہے کہ مدارس دینیہ کو مسموم اور مولویوں کو مسٹر بنانے کے بجائے کالجوں کی اصلاح اور مسٹروں کو صحیح مسلمان بنانے پر پوری قوت صرف کرنا چاہیے۔ فقط واللہ العاصم۔

۱۸/ ربیع الاول/ ۸۹ھ۔

(احسن الفتاویٰ، جلد:۱)